

اُردو رباعی: تنوعاتِ اسالیب و موضوعات

سید عامر عالم رضوی*

اُردو شاعری اصنافِ سخن کے تجربات سے مالا مال ہے۔ رباعی اپنی ہیئت اور شرائط کے اعتبار سے کسی قدر مشکل ضرور ہے مگر جامعیت اور اختصار کی بدولت اُردو شاعری کی ابتدا سے تاحال شعرا کے یہاں مقبول ہے۔ اس مقالے میں دکنی عہد سے تاحال رباعی کے عہد بہ عہد ارتقائی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے لیے اُردو ادب کے تین اہم ادوار سے ۳۷ شعرا کی ایک سو بیسی رباعیات کا تجزیہ کر کے رباعی کی موضوعاتی وسعت اور تنوع کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

رباعی اُردو کی شعری اصناف میں غزل، مرثیہ اور مثنوی کی طرح ایک اہم اور مشہور و مقبول صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ رباعی عربی لفظ رباع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں چار (۴) یعنی شاعر فقط چار مصرعوں میں بلند اور نئے موضوع و مضمون کو کمالِ خوب صورتی اور فنی مہارت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے یہی اس کی شاعرانہ مہارت اور تخلیقی صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

رباعی بحرِ رباعِ مثنیٰ (اخر یا اُخر) میں لکھی جاتی ہے اور اس کے چوبیس (۲۴) اوزان مقرر ہیں۔ رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ چوتھے مصرعے پر رباعی کی عمدگی اور تاثیر کا انحصار ہوتا ہے۔ چونکہ رباعی میں ایک وسیع مضمون کو سمیٹ کر بیان کیا جاتا ہے اس لیے ایجاز و اختصار اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ رباعی کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ حمد، نعت، منقبت، دنیا کی بے ثباتی، تصوف، فلسفہ، عشق، سیاست، اخلاقیات، مناجات، منظر نگاری، غرض ہر موضوع پر رباعی کہی جاسکتی ہے۔^۱

رباعی فارسی کے توسط سے اُردو میں آئی اور بالعموم رُود کی وہ فارسی شاعر ہے جسے اس صنف کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ بعد میں بابا طاہر عریاں، عمر خیام، سرمد، ابو سعید ابوالخیر، فرید الدین عطار اور شیخ سعدی نے اس صنف کو اور نکھارا اور بلند پایہ مضامین بڑی خوبی، عمدگی اور فنی مہارت کے ساتھ اپنی رباعیوں میں پیش کیے۔ جہاں تک اُردو رباعی کا تعلق ہے تو اس صنف میں قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی، ولی، سودا، درد، میر، انشا، میر حسن، نظیر، ذوق، غالب، مومن، انیس، دبیر، حالی، اکبر، اقبال، امجد حیدر آبادی، جوش، فراق، یگانہ، فانی، محروم، عبدالباری آسی،

* ریسرچ اسکالر، انسٹی ٹیوٹ آف بزنس مینجمنٹ، کراچی، مقیم کراچی

اُردو رباعی: تنوعات اسالیب و موضوعات
سید عامر عالم رضوی
مہاراجہ سرکشن پرشاد، اثر صہبائی، راغب مراد آبادی، شور علیگ اور دیگر بہت سے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اور رباعی کہنے کا یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اُردو میں سب سے پہلے رباعی کس شاعر نے کہی تو اس سلسلے میں اگر اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے کلیات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کے یہاں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے اور قطعات کے ساتھ ساتھ رباعیات بھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔ اس بنا پر بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:
آج تک کی تاریخی تحقیق کی بنا پر اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کی رباعیوں کو اُردو رباعی کا قدیم ترین نمونہ سمجھنا چاہیے۔^۲

قلی قطب شاہ کی زندگی ایک سلطنت کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے خوش حالی، فارغ البالی اور عیش و عشرت میں گزری۔ لہذا ان کی شاعری میں بھی حسن و عشق کا عنصر نمایاں ہے اور یہی چیز ہمیں ان کی رباعیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ویسے انھوں نے دیگر موضوعات پر بھی رباعیاں کہی ہیں تاہم ان کی رباعیوں میں محبوب کا تذکرہ اور عشقیہ مضامین بہ کثرت ملتے ہیں۔ مثلاً:

کہیا ترے لب کیا ہیں، کہی آبِ حیات
کہیا کہ تری لہذا، کہی حبِ نبات
کہیا کہ بچن تیری، کہی قطب کی بات
اس میٹھی لطافت پہ سدا ہے صلوات

☆☆☆

اُس لٹ کوں لٹ پٹ سوں پکڑ • کینا نیاز
کہیا کہ مرا چارہ کریں اے ورساز
منج کی کہ مرا ہونٹ پکڑ لٹ کوں تو چھوڑ
ہے تج کوں انند ہوور سدا عمر دراز

سراج اورنگ آبادی نے بھی رباعی کی صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو شاعری میں سراج نے جو بلند مرتبہ پایا ہے اس سے انکار ناممکن ہے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ!
سراج کے پاس ایک احساسِ قناعت، تسلیم و رضا، سپردگی بلکہ درد میں لذت کی چاشنی موجود ہے۔ شکایت یا انتقام کا جذبہ ان کے دل میں کم پیدا ہوتا ہے۔ غرض سراج کے کلام کا مطالعہ کرنے والا سب سے زیادہ جس

کیفیت کو محسوس کرتا ہے وہ ان کا درد آگیں انداز ہے اور یہ خصوصیت نہ صرف ان کی غزل میں موجود ہے بلکہ ہر صنفِ کلام کا یہی نمایاں وصف ہے۔^۲

مثلاً ان کی یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں!

ہر آن ترے خیال میں ہوں مشغول
ایک بار نگاہِ مہربانی سیں نہ بھول
بندہ ہوں ترا ہمیشہ جان و دل سیں
اے قادرِ بے نیاز کر مجھ کو قبول

☆☆☆

اُس شوخ نے اب شیوہ تمکین لیا
آئینِ جفا کا مذہب و دین لیا
ظالم نے ستم کیا مجھے بے کس بوجھ
تک آنکھ دکھا کے دل مرا چھین لیا

☆☆☆

جس حسن کے دیکھے سیں دو عالم دک (دھک) ہے
اُس حسن کے رہنے کا مکاں یہ جگ ہے
یہ قرصِ سیاہ (سیہ) نہیں میری (مری) آنکھوں میں
مرشد کے جمال کی یہی عینک ہے

☆☆☆

اس شامِ جدائی میں مجھے آ دیکھو
الطاف و کرم کوں کارفرما دیکھو
خورشیدِ دُبا شفق کے لوہو میں تمام
تک اپنے شہید کا تماشا دیکھو

ولی دکنی کی کلیات میں بھی رباعیاں موجود ہیں۔ مثلاً:

یہ ہستی موہوم دسے مجھوں سراب
پانی کے اُپر نقش ہے یہ مثلِ حباب
ایسے کے اُپر دل کوں نہ کر ہرگز بند
آپس کوں نہ کر خراب اے خانہ خراب

☆☆☆

تجھ عشقُ سوں نت بے سرو ساماں ہوں میں
تجھ زلفُ سوں بے تاب و پریشاں ہوں میں
تجھ کھ کی صفائی کوں نظر میں رکھ کر
مدت سستی جیوں آئینہ حیراں ہوں میں

خدائے سخن میر تقی میر اُردو کے شعرا میں جس بلند مقام پر فائز ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔ سوز و گداز اور درد و غم ان کی تمام تر شاعری کا محور و مرکز ہے۔ بے ثباتی دنیا، موت کا خیال، اخلاقی مضامین اور علاقہ دنیوی سے دوری، ان تمام موضوعات و مضامین کو میر نے بڑے اچھے، دل نشین اور موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

مثلاً ان کی یہ رباعیات ملاحظہ ہوں!

بس حرص و ہوس سے میر اب تو بھاگو
غفلت کب تک کہے ہمارے لاگو
چلنے کی خبر دے ہے سفیدیِ مو کی
ہونے آئی ہے صبح اب تو جاگو

☆☆☆

اوقاتِ جوانی کے گئے عشرت میں
ایامِ لڑکپن کے کٹے غفلت میں
پیری میں ہرز افسوس کیا کیا جائے
یک بار کی آ ہی گئی طاقت میں

☆☆☆

اب وقتِ عزیز کو تو یوں کھوؤ گے
پر سوچ کے غفلت کے تئیں روؤ گے
کیا خوابِ گراں پہ میل روز و شب ہے
جاگوں تک میر پھر بہت سوؤ گے

☆☆☆

کیسا احساں ہے خلقِ عالم کرنا
پھر عالمِ ہستی میں مکرم کرنا
تھا کارِ کرم ہی اے کریم مطلق
ناچیز کفِ خاک کو آدم کرنا

خواجہ میر درد، میر تقی میر کے ہم عصر اور صوفیانہ شاعری میں درجہء کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ حسن و عشق کے مضامین کے ساتھ ہی انھوں نے تصوف کے مضامین کو بھی بڑی فنی مہارت کے ساتھ شاعرانہ صورت دی ہے۔ ان کی شاعری عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کا بہترین مرقع ہے۔ غزل کے ساتھ ساتھ رباعیوں میں بھی انھوں نے عشقیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ اخلاقی موضوعات کو بھی بیان کیا ہے۔ مثلاً ان کی یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں:

مدت تئیں باغ و بوستاں کو دیکھا
یعنی کہ بہار اور خزاں کو دیکھا
'جوں آئینہ کب تلک پریشاں نظری
اب 'موندیے آنکھ بس جہاں کو دیکھا

☆☆☆

'موند آنکھ سدا کب تئیں دل ٹالے گا
غفلت کے تئیں بغل میں یوں پالے گا
اے درد مراقبہ تو کرتے ہو ولے
تک اپنا گریباں میں بھی سر ڈالے گا

☆☆☆

جب سے توحید کا سبق پڑھتا ہوں
ہر حرف میں کتنے ہی ورق پڑھتا ہوں
اس علم کی انتہا سمجھنا آگے
اے درد ابھی تو نام حق پڑھتا ہوں

ادبی تاریخ کا جائزہ لینے پر محسوس ہوتا ہے کہ غالب اور انیس کا دور اُردو شاعری کے لیے نہایت اہم دور ثابت ہوا۔ جہاں لکھنؤ میں انیس ودیر اور دیگر مرثیہ گو شعرا نے رباعی کو بام عروج پر پہنچایا اسی طرح دہلوی شعرا نے غزل کے ساتھ ساتھ رباعی کو بھی فروغ دیا۔

دہلی کے شعرا میں (غالب، مومن، ذوق، ظفر اور شیفتہ) فقط مومن خاں مومن کے یہاں ہمیں رباعیاں خاصی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ غالب کے یہاں اور ذوق کے دیوان میں رباعیاں بہت قلیل تعداد میں ہیں جب کہ ظفر کے دیوان میں رباعیات نہیں ملتیں البتہ مومن وہ دہلوی شاعر ہیں جنہوں نے رباعی کی طرف باقاعدہ دھیان دیا اور اس سلسلے میں وہ اپنے معاصرین شعر پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کی یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں:

وصلت میں کبھی مزہ نہ پایا ہم نے
عشق ایک فریب تھا جو کھایا ہم نے
اے کاش کہ جان دل سے پہلے دیتے
جس کے باعث عذاب اُٹھایا ہم نے

☆☆☆

بدنام کیا تر اُبرا ہو اے دل
ناکام کیا تر اُبرا ہو اے دل
مومن کو بتوں سے کیا سروکار بھلا
کیا کام کیا تر اُبرا ہو اے دل

☆☆☆

جنت میں ہے روزِ حشر جانا مومن
نادان نہ بن کہ تو ہے دانا مومن
ہر رات نہ مل روئے صنم سے آخر
اک دن ہے خدا کو منہ دکھانا مومن

دہلوی شعرا کی بہ نسبت لکھنوی شعرا نے بالخصوص انیس و دہیر نے مرثیے کی طرح رباعی کی صنف کو بھی اہم، لائق توجہ اور قابلِ قدر صنف بنادیا۔ لکھنؤ میں یہ ایک رسم و رواج سا بن گیا تھا کہ شعرا آغازِ مجلس سے پہلے سامعین کے اذہان و قلوب کو متوجہ کرنے کی خاطر رباعیاں پڑھا کرتے تھے اور مورخین کے نزدیک یہی رسم و رواج رباعی کی مقبولیت کا سبب بنا۔ چنانچہ وہ لکھنوی شعرا جو رباعی کی طرف متوجہ نہ تھے وہ بھی رباعی کہنے لگے۔ لکھنوی شعرا میں انیس و دہیر کے یہاں رباعیات کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ "انیسُ الاخلاق" کے نام سے نظامی پریس لکھنؤ سے اور پھر رباعیاتِ انیس کے نام سے ۱۹۴۸ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے ان کی رباعیات کے مجموعے شائع ہوئے۔ انیس کی رباعیوں میں متغزلانہ دل کشی کے بجائے واقعاتِ کربلا کے ساتھ ساتھ مذہبی معتقدات، پسند و ناصح اور اخلاقی مضامین کا ذکر بڑی خوبی، عمدگی اور فنی و تخلیقی مہارت و کمال کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً:

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یامعدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جاتری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

☆☆☆

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
افزوں ہے تیرے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا
وہ رحم ترا ہے یہ عدالت تیری

☆☆☆

ہر آن تغیری ہے زمانے کے لیے
انسان کا دل ہے داغ اٹھانے کے لیے
بوڑھا ہو کہ نوجواں غنی ہو کہ فقیر
سب آئے ہیں اس خاک میں جانے کے لیے

☆☆☆

خلق و تعظیم دولتِ دینی ہے
ہر عیب کا عیب، عیبِ خودِ دینی ہے
ہوتی ہے گنہ گار کی توبہ بھی قبول
خالق کو پسند عجز و مسکینی ہے

☆☆☆

شہرہ ہر سو جو خوش کلامی کا ہے
باعث مدحِ امامِ نامی کا ہے
میں کیا، آواز کیسی، پڑھنا کیسا
آقا یہ شرف تری غلامی کا ہے

میر انیس کے ہم عصر اور مشہور مرثیہ گو مرزا دبیر نے بھی بڑی تعداد میں رباعیاں کہیں ہیں۔ ان کی رباعیوں میں بھی کم و بیش وہی موضوعات ملتے ہیں جو میر انیس کے یہاں ہیں۔ مثلاً!

یارب خلاقِ ماہ و ماہی تو ہے
بخشنده تاج و تختِ شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الہی تو ہے

☆☆☆

اک دن پیوندِ خاک ہونا ہوگا
تنہا تنہا لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر
جو اوڑھنا ہوگا وہ کچھونا ہوگا

☆☆☆

ناداں کہوں دل کو یا خردمند کہوں
یا سلسلہ وضع کا پابند کہوں

اک روز خدا کو منھ دکھانا ہے دبیر
بندوں کو میں کسی طرح خداوند کہوں

☆☆☆

اعمال کی تیرگی وضو سے نہ گئی
ظلمت عصیاں کی شست و شو سے نہ گئی
پیری آئی جوانی گزری افسوس
بالوں سے سیاہی گئی رُو سے نہ گئی

بعد میں آنے والے شعرا انیس و دبیر کی رُباعیوں کے اثرات سے خود کو نہ بچا سکے اور خود بھی اس صنفِ سخن میں طبع آزمائی پر مجبور ہو گئے۔ ان میں حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبر، پیارے صاحب رشید اور شاد عظیم آبادی شامل ہیں۔ مولانا حالی نے اپنی رُباعیات میں حمدیہ اور نعتیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ مسلمان قوم کی جہالت، زوال کے اسباب، مکر و فریب، قومی ہمدردی، محنت کے فوائد، علم و فن کی برکتوں اور انسانی زندگی میں ٹوٹل، قناعت اور وقت کی اہمیت جیسے مضامین بیان کیے ہیں۔ رُباعیاتِ حالی کے نام سے ان کی رُباعیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کی چند رُباعیات دیکھیے۔

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

☆☆☆

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہم سر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا
جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

☆☆☆

ہیں یار رفیق پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انساں سے توقع ہے عبث
جو نوع بشر کی خود جبلت میں نہیں

حالی کے ساتھ ساتھ اکبر الہ آبادی نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ جس طرح اکبر نے اپنی شاعری میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ قومی اصلاح پر زور دیا کم و بیش اسی طرح اپنی رباعیوں میں بھی یہی انداز اور پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔ اکبر نے مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی موضوعات کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں شائستگی اور وقار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانان ہند کی زُربوں حالی نے جہاں سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کار سے قومی و معاشرتی اصلاح کا نازک اور اہم کام لیا وہیں اکبر الہ آبادی نے بھی اپنی شاعری میں مزاح اور ظرافت سے قومی و سماجی اصلاح کا کام انجام دیا اور یہی مخصوص و منفرد اندازِ ظرافت ان کی رباعیوں کی بھی امتیازی خصوصیت ہے جس کے ذریعے انھوں نے سنجیدہ موضوعات کو بھی اپنی رباعیوں میں پیش کیا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

اکبر کی بدولت رباعی میں حسن و عشق کی عظمت، مذہب، اخلاق اور پند و نصائح کے ساتھ ساتھ نہ صرف تعمیری طنز اور مفید مزاح نگاری کو جگہ مل گئی بلکہ جدید اسالیب کی مدد سے زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کا ایسا راستہ نکل آیا جس نے رباعی کو آگے بڑھنے میں مدد دی۔^۱

مثلاً ان کی یہ رباعیاں دیکھیے:

جب نورِ یقیں نہیں بصارت کیسی
طاقت ہی نہیں دلوں میں ہمت کیسی
اسلام نئی روشنی میں کیا ہو یک رخ
مسجد ہی نہیں تو پھر جماعت کیسی

☆☆☆

خاطر مضبوط، دل توانا رکھو
امید اچھی، خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمھاری آساں
اکبر اللہ پر بھروسا رکھو

☆☆☆

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے جو نقل انگریز کرو

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نہ صرف سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کے فرماں روا تھے بلکہ ادب نواز، سخن فہم اور ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ ادبا و شعرا کے بڑے قدردان تھے اور ان کی سرپرستی فرماتے تھے۔ خود بھی شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے رباعی کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی رباعیاتِ شاد کے نام سے ان کا مجموعہ رباعیات مطابق ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا جس میں ۱۹۰ رباعیاں ہیں۔ ان کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

ہیں باعثِ ایجادِ جہاں جو شہِ دیں
وہ مظہرِ ذاتِ حق ہیں کر شاد یقیں
ہوتا ہی نہیں باپِ ہدایت کبھی بند
گر ختم رسالت ہے ولایت تو نہیں

☆☆☆

دنیا کی کروں لے کے میں کیا عزت و جاہ
سب چھوڑ کے بے فکر ہوں شاہوں کا ہوں شاہ
دنیا کی محبت سے وہ کیا شاد رہے
جس کی ہو خطاب "نقیرِ فخری" پہ نگاہ

☆☆☆

رکھو نہ کسی سے دل میں تم بغض و حسد
مذہب کا تعصب نہ کوئی اور ہی کد
اصلاح ہو کس طرح سے اُس کی اسے شاد
جو بعض و حسد کو نہ کرے دل سے رد

☆☆☆

محسوس نظر جو ہے وہ ہے وہم و خیال
دنیا جسے کہتے ہیں وہ دھوکے کا ہے جال
عرفان جو حاصل کرے اے شاد کوئی
کھل جائے گا دنیا کا سب اس پر احوال

☆☆☆

کہتے ہیں جسے موت وہ ہے عین سرور
دنیا کی کثافتوں کو کرتی ہے دور
ہوتی ہے نکل کے تن سے بالیدہ روح
جسم خاکی پہ کر نہ اے شاد غرور

☆☆☆

یارب یہ رعایاے دکن شاد رہے
اولاد سے احفاد سے آباد رہے
عثمان علی خاں رہیں دائم قائم
جو شاہ کا دشمن ہو وہ برباد رہے

علامہ اقبال کی رباعیات پر نظر ڈالیں تو ان میں بھی ہمیں کم و بیش وہی موضوعات و مضامین نظر آتے ہیں جو ان کی نظموں میں بیان کیے گئے ہیں مثلاً خودی، عشق اور جہد و عمل کے پہلو کو اپنی زندگی اور فکر و عمل کا محور و بنیاد بنانے کی تعلیم و ترغیب اور یہی علامہ کی شاعری کا وہ اہم، روشن اور مثبت پہلو ہے جس نے مسلمانان ہند خصوصاً جوانان ملت اسلامیہ کے دلوں میں حرارت، جوش، انگریزوں کی سیاسی چالوں کو سمجھنے، ہندوؤں کے متعصبانہ رویوں کو پہچاننے، اور بہ حیثیت مسلمان اپنے اہمیت اور اپنے تشخص سے آگاہ ہونے اور ہر لمحہ جہد و عمل کے جذبے سے مالا مال کر دیا۔ مثلاً ان کی یہ رباعیات ملاحظہ کیجیے۔

ظلام بحر میں کھو کر سنبھل جا
تڑپ جا پیچ کھا کھا کر بدل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

☆☆☆

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

☆☆☆

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدہ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

☆☆☆

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقام رنگ وُبو کا راز پا جا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ
کف ساحل سے دامن کھینچتا جا

☆☆☆

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایہء محراب و منبر
کبھی مولا علی خیر شکن عشق

☆☆☆

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

اسمعیل میر ٹھی نے بھی رباعیاں کہیں ہیں۔ ان کے کلیات (مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۳۹ء) میں تقریباً اسی (۸۰) رباعیات ہیں جن میں متصوفانہ، اخلاقی اور اصلاحی موضوعات و مضامین کو انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ان کی یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں:

حق ہے تو کہاں ہے پھر مجالِ باطل
حق ہے تو عبث ہے احتمالِ باطل
ناحق نہیں کوئی چیز راہِ حق میں
باطل کا خیال ہے خیالِ باطل

☆☆☆

اے بارِ خدا یہ شور و غوغا کیا ہے
کیا چیز طلب ہے اور تمنا کیا ہے
ہے کم نظری سے اشتیاقِ دیدار
جو کچھ ہے نظر میں یہ تماشا کیا ہے

☆☆☆

دنیا کا نہ کھا فریب ویران ہے یہ
راحت سے نہ دل لگا کہ مہمان ہے یہ
بچِ نفسِ دنی سے ہے بڑا ہی کافر
کر روح کی پرورش مسلمان ہے یہ

☆☆☆

دنیا کو نہ تو قبلہٗ حاجات سمجھ
’جز ذکرِ خدا سب کو خرافات سمجھ
اک لمحہ کسی مردِ خدا کی صحبت
آجائے میسر تو بڑی بات سمجھ

☆☆☆

اے بے خبری کی نیند سونے والو
راحت طلبی میں وقت کھونے والو
کچھ اپنے بچاؤ کی بھی سوچی تدبیر
اے ڈوبتی ناؤ کے ڈوبنے والو

☆☆☆

ڈھونڈا کرے کوئی لاکھ کیا ملتا ہے
دن کا کہیں رات کو پتا ملتا ہے
جب تک کہ ہے بندگی خدائی کا حجاب
بندے کو بھلا خدا کہیں ملتا ہے

☆☆☆

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار
بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار ہے مگر نہ اتنا دشوار
بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

شاد عظیم آبادی نے بھی باقاعدہ اور بڑی تعداد میں رباعیاں لکھی ہیں جو ایک مجموعے رباعیات شاد، مسسٹی بہ، گنجینہ عرفان کے نام سے شائع ہوئیں۔ ان رباعیات کا منظوم ترجمہ سر نظامت جنگ بہادر نے کیا اور اس مجموعے کو حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے کرشنا پریس پٹنہ سے ۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔ ان رباعیات میں متصوفانہ مضامین کے ساتھ اخلاقی موضوعات اور پند و نصائح کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ بقول حمید عظیم آبادی!

رباعیوں کی جو شان ہونی چاہیے وہ ہر رباعی سے ظاہر ہے۔ اُردو کا جہاں تک تعلق ہے حضرت شاد نے رباعیوں میں بھی اپنی شمشیر طبع کا جوہر دکھانے میں کوتاہ دستی سے کام نہیں لیا ہے۔ کمالِ مشق کا ہر مصرع آئینہ دار ہے اور ہر رباعی سے ذی کمالی ہویدا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر فلسفیانہ اور صوفیانہ رنگ کی ہیں لیکن بعض بعض رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں کہیں پیری کا فسانہ ہے اور کہیں شباب کی فراموش شدہ داستانِ پارینہ۔ کہیں ارباب وطن کی ناقدری کا خاموش گلہ ہے اور کہیں کوتاہی کمال پرستی کا بے جا شکوہ۔ مختصر یہ کہ ۹۵ رباعیوں کا یہ مجموعہ بو قلموں اور رنگارنگ گل ہائے مضامین کا وہ جاذب نظر اور فرحت بخش گل دستہ ہے جو اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مثلاً شاد کی یہ رباعیات دیکھیے۔

ہر دم مرے دل میں تو ہی موجود رہے
ہر قصد میں یار! تو ہی مقصود رہے
جب آنکھ اٹھاؤں ترا جلوہ دیکھوں
جب سر کوجھکاؤں تو ہی مسجود رہے

☆☆☆

تنہا ہے چراغ، دُور پروانے ہیں
اپنے تھے جو کل آج وہ بے گانے ہیں
نیرنگی دنیا کا نہ پوچھو احوال
قصے ہیں، کہانیاں ہیں، افسانے ہیں

☆☆☆

جس دل میں غبار ہو وہ دل صاف کہاں
پھر خلق کہاں وفا و الطاف کہاں
جس قوم میں آگیا تعصب کا قدم
اس قوم میں اے شاد پھر انصاف کہاں

☆☆☆

بدلے نہ صداقت کا نشان ایک رہے
ہر حال میں پنہاں و عیاں ایک رہے
انساں ہے وہی جو اس دو رنگی سے بچے
لازم ہے کہ دل اور زباں ایک رہے

امیر مینائی اور پیارے صاحب رشید کے یہاں بھی رباعیاں ملتی ہیں۔ امیر مینائی اپنے وقت کے بڑے غزل گو شاعر تھے اور اُستاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگردوں نے بھی شاعری میں بڑا نام پایا۔ غزل کے ساتھ ساتھ امیر مینائی ایک اچھے نعت گو شاعر بھی تھے۔ ان کی رباعیاں بھی نعتیہ انداز لیے ہوئے ہیں۔ ادبی چاشنی اور شاعرانہ حسن و لطافت ان کی رباعیوں کی بھی بڑی خصوصیت ہے۔ ان کی یہ رباعیاں ملاحظہ ہوں:

گزرے جب عرش سے جنابِ والا
اللہ رے شوقِ دیدِ قدِ بالا
’طوبیٰ نے یہ سر اٹھا کے حسرت سے کہا
مضمونِ قیامت گیا بالا بالا

☆☆☆

کیا لطف اگر سارا زمانہ دیکھے
دیکھے تو نگاہِ چشمِ دانا دیکھے
کر گلشنِ اُلفت میں گزر مثلِ نسیم
آنا دیکھے نہ کوئی جانا دیکھے

☆☆☆

خواہاںِ طرب ہے جسے ادراک نہیں
آرامِ تہِ گنبدِ افلاک نہیں
پیماۂ گردوں میں کہاں بادِ عیش
’جز دُردِ تہِ جامِ یہاں خاک نہیں

☆☆☆

بالفرض حیاتِ جاودانی تم ہو
بالفرض کہ آبِ زندگانی تم ہو
ہم سے نہ ملو تو خاک سمجھیں تم کو
لیں نام نہ پیاس کا جو پانی تم ہو

پیارے صاحبِ رشید نے جس طرح مرثیہ گوئی میں بڑا نام پایا اُسی طرح اُنھوں نے رباعی کی صنف میں بھی پورے شاعرانہ کمال کے ساتھ اخلاقی و اصلاحی مضامین پیش کیے ہیں۔ شباب کی رخصت اور پیری کی آمد اور پھر ایامِ پیری میں دل کے جذبات و احساسات کی کیفیات کو بڑی خوبی، مہارت اور اثر انگیز صورت میں اپنی زیادہ تر رباعیوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً یہ رباعیات ملاحظہ ہوں:

دنیا کے نہ رنج و درد و غم کو دیکھو
کس حال میں ہیں؟ اہلِ عدم کو دیکھو
پیری کا تماشا ہو اگر مدِ نظر
یارانِ شباب آؤ ہم کو دیکھو

☆☆☆

پیری سے ہیں خمِ راہِ جناب کیوں کر لیں
اک عمر پھرے ہیں دم ذرا دم بھر لیں
لیٹے ہیں لحد میں اے فرشتوں نہ ستاؤ
چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں

☆☆☆

دل کو سو سو طرح کے غم کھانے دو
پیری جو رشید آئی ہے آجانے دو
جانے کا جوانی کے ہے غصہ بے کار
دیکھو اپنی طرف بس اب جانے دو

مولوی عبدالباری آسی کا شمار بھی اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ مولانا نے غزل، نظم، قصیدے، مثنوی اور رباعی سب ہی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے تاہم غزل اور رباعی سے ان کی طبیعت اور مزاج کو خاص لگاؤ تھا۔ غزلوں کا مجموعہ غالباً شائع نہ ہو سکا البتہ رباعیات کا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے رباعیاتِ آسی کے نام سے شائع ہوا جس میں ۵۶۷ رباعیات شامل ہیں۔ مولانا کی کچھ رباعیات پیش کی جاتی ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کن کن موضوعات کو کس خوب صورتی اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مخمورِ شراب بے نیازی ہو جا
مہجورِ معاصی و مناہی ہو جا
مشکل نہیں کچھ خدا کا راضی ہونا
پہلے تو تو خدا سے راضی ہو جا

☆☆☆

عقبی کو نہ جان اپنی دنیا کا بدل
جو آج ہے بات غیر ممکن ہے وہ کل
دنیا میں عمل ہے اور نہیں کوئی حساب
عقبی میں حساب ہے نہیں کوئی عمل

☆☆☆

ہم منکرِ اولیا و اختیار نہیں
ہم اُن سے کشیدہ مثلِ اشرار نہیں
لیکن خالق کو چھوڑ کر اے اسی
بندوں سے مدد کے ہم طلب گار نہیں

☆☆☆

انسان سے زیادہ کس کی حالت ہے تباہ
انسان سے زیادہ کون ہے نامہ سیاہ
یہ وہ ہے کہ روز جس کی گھٹی ہے عمر
یہ وہ ہے کہ روز جس کے بڑھتے ہیں گناہ

☆☆☆

الفت میں مرے تو زندگی ملتی ہے
غم لاکھ سہے تو اک خوشی ملتی ہے
ہر شمع کو بزمِ دہر میں اسی
جلنے ہی کے بعد روشنی ملتی ہے

☆☆☆

کس بات کا خوف ہے یہ کیا ڈر ہے
کیا موت نظامِ زیست سے باہر ہے
اتنا ہی تو موت و زیست میں ہے فرق
کل سر پہ تھا چاند آج تربت پر ہے

☆☆☆

ہیں بے خبر مال آفت یہ ہے
صورت ہی کوئی نہیں ہے صورت یہ ہے
منزل جو دراز ہو تو کچھ خوف نہیں
منزل کی خبر نہیں قیامت یہ ہے

یوں تو داغ، ریاض، فانی، سرور جہاں آبادی، نظم طباطبائی، چکبست، شوق قدوائی اور عزیز لکھنوی وغیرہ نے بھی رباعیاں لکھیں لیکن جوش، امجد حیدر آبادی، فراق، رواں، محروم، یگانہ اور شور علیگ نے بے مثال و لا جواب رباعیاں لکھیں۔ جنگِ عظیم اول بعد معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں آئیں جن سے شاعری اور ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُس عہد کے مشہور غزل گو شعر افانی، اصغر، جگر اور حسرت میں سے فانی نے بطور خاص رباعی کی طرف توجہ دی۔ عبدالحق اکیڈمی حیدر آباد دکن سے ۱۹۴۶ء میں فانی کا کلیات شائع ہوا جس میں تقریباً دو سو (۲۰۰) رباعیاں شامل ہیں۔ غزلیہ شاعری کی طرح فانی کی رباعیات میں بھی درد و غم اور حزن و ملال کا عنصر نمایاں ہے۔ فانی غم کا احساس لے کر پیدا ہوئے تھے اور ہر چیز یہاں تک کہ ہر معاشرتی ناہمواری، سماجی زبوں حالی اور لوگوں کے دکھوں اور غموں سے بے حد متاثر ہوتے تھے جس کی وجہ سے ان کی طبیعت اور مزاج میں ایک ایسی گھٹن اور دل کو گھلانے والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو ان کی غزلوں اور رباعیوں کا خاص محور و مرکز ہے۔ مثلاً ان کی یہ رباعیاں دیکھیے:

بجھتی نہیں شمع جلے جاتی ہے
کٹتی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی
سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

☆☆☆

کتنوں کو جگر کا رخم سہتے دیکھا
دیکھا جسے خونِ دل ہی پیتے دیکھا
اب تک روئے تھے مرنے والوں کو اور اب
ہم رو دیے جب کسی کو جیتے دیکھا

☆☆☆

ناعاقبت اندیش قیامت کو سمجھ
مظلوم سے ڈر خدا کی عادت کو سمجھ
یہ عرش کو سو بار ہلا آتی ہے
آوازِ شکستِ دل کی طاعت کو سمجھ

جوش ملیح آبادی اس دور کے اہم، ممتاز اور منفرد رباعی گو شاعر ہیں۔ ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ جنون و حکمت کے نام سے شائع ہوا جس میں ۱۹۳۷ء تک کی رباعیات شامل ہیں، جن کی تعداد ۲۱۵ ہے۔ دوسرا مجموعہ سموم و صبا کے نام سے شائع ہوا۔ ابتدا میں کچھ نظمیں ہیں جو ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء کے عرصے پر محیط ہیں پھر رباعیات ہیں جو ۱۹۴۲ء تا ۱۹۵۲ء کے درمیانی عرصے میں کہی گئی ہیں جن کی کل تعداد ۲۳۸ ہے۔ ایک اور مجموعہ نجوم و جواہر کے نام سے شائع ہوا۔ جوش ایک قادر الکلام شاعر تھے انھوں نے جس اعلیٰ پائے کی نظمیں اور مرثیے لکھے اُسی نوعیت کی رباعیاں کہیں جن میں رنگارنگی بھی ہے اور ہمہ گیری بھی، شراب و شباب، حسن و عشق، جمالیات و جذباتیت، فکر و فلسفہ، تصوف، فطرت اور اس کے مناظر کی تصویر کشی، سیاسی و سماجی مسائل، جمہوریت اور سامراجیت و فسطائیت، سائنس کے جدید تجربات و رجحانات اور انسانی زندگی پر ان کے ممکنہ اثرات، معتقدات مذہب، یہ تمام وہ موضوعات ہیں جنہیں جوش نے اپنے پورے تخلیقی و فنی کمال کے ساتھ اپنی رباعیات میں پیش کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ جوش نے بے مثال رباعیاں کہہ کر اس صنفِ سخن کو ایسی شہرت و مقبولیت عطا کی جس نے بعد کے شعر اکو اس صنفِ سخن کی جانب متوجہ کیا۔ جوش کی کچھ رباعیات ملاحظہ ہوں:

اپنے ہی دماغ و دل کا مقہور ہوں میں
خود اپنے ہی دل میں ایک ناسور ہوں میں
واقف ہوں کہ سوچنے میں ہے جی کا زیاں
کیا کیجیے سوچنے پہ مجبور ہوں میں

☆☆☆

اس فکر میں اک عمر سے ہوں بے خود و خواب
کس طرح معطل ہوں رسوم و آداب
اچھی تو ہے وضعِ راست گوئی لیکن
برداشت بھی کر سکیں گے اس کو احباب

☆☆☆

اللہ رے بدست جوانی کا نکھار
ہر نقش قدم پہ سجدہ کرتی ہے بہار
اس طرح وہ گامزن ہے فرشِ گل پر
پڑتی ہے ہری دھوپ پہ جس طرح بہار

☆☆☆

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
انساں کو ہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گناہ جو احمق اُن کو
بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

☆☆☆

پھولوں کی اگر ہوس ہے خاروں کو نہ دیکھ
عشرت کی ہے دُھن تو سو گواروں کو نہ دیکھ
تعمیرِ حیات ہے اگر پیشِ نظر
مڑ کر بھی مٹے ہوئے مزاروں کو نہ دیکھ

☆☆☆

جب حدِ مطلب سے دل نکل جاتا ہے
سانچے میں طرب کے درد ڈھل جاتا ہے
کر لیتی ہیں غم کا جب احاطہ نظریں
ہر اشک تبسم میں بدل جاتا ہے

☆☆☆

اس دہر میں تادیر ٹھہرنا بہتر
یا تیز روی سے کوچ کرنا بہتر
بس زندہ ہوں اب تک اس تذبذب کے طفیل
جینے میں ہے فائدہ کہ مرنا بہتر

☆☆☆

بہتی ہوئی دانش سے حماقت بہتر
ناپختہ ذہانت سے غبادت بہتر
جو راہ طلب میں بیٹھ جائے تھک کر
اُس علمِ قلیل سے جہالت بہتر

☆☆☆

مقصودِ کمال کیا ہے کس سے پوچھوں
تعبیرِ زوال کیا ہے کس سے پوچھوں
دانا مہبوت ہیں پیہر خاموش
ہستی کا مال کیا ہے کس سے پوچھوں

☆☆☆

جھومی تاریک رات میرے دل میں
بدمست ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے سُبُو دے کے اٹھایا جو رباب
گم ہو گئی کائنات میرے دل میں

☆☆☆

کس رات کو کی نہ بادہ خواری ہم نے
کب کاکلِ عشرت نہ سنواری ہم نے
اب تک تو یہ رات جس کو کہتے ہیں شباب
زُلفوں ہی کے سائے میں گزاری ہم نے

☆☆☆

کب موت کی دل لگی سے ڈرتا ہوں میں
محشر سے نہ زندگی سے ڈرتا ہوں میں
اغیار کی دشمنی سے ڈرنا کیسا
احباب کی دوستی سے ڈرتا ہوں میں

☆☆☆

ہر سانس کو اک عذاب پایا میں نے
عشرت کی طلب سے ہاتھ اٹھایا میں نے
جب سینہ ہوا خروشِ دل سے محروم
بوتل کو کلیجے سے لگایا میں نے

جوش کی طرح امجد حیدر آبادی نے بھی بکثرت رباعیات کہی ہیں لیکن جوش کے برعکس امجد ایک صوفی اور خدا ترس آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیات کے موضوعات تصوف و عرفان حقیقی، اخلاق و حکمت اور عبادت و تقویٰ الہی ہیں۔ امجد حیدر آبادی کی تین جلدوں پر مشتمل تقریباً ۲۴۸ رباعیاں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے الفاظ میں ”اُردو میں رباعی کے ساتھ امجد کو وہی خصوصیت حاصل ہو گئی ہے جو فارسی میں سرمد و عمر خیام کو۔ امجد کی ہر رباعی کسی قرآنی نکتے یا حدیث کی تفسیر ہوتی ہے۔ متصوفانہ شاعروں میں درد کے بعد اگر کسی شاعر نے تصوف کو اپنی فکر کا محور بنایا ہے تو وہ امجد ہی ہیں۔ ان کی رباعی کا آخری مصرع ایسا برجستہ اور پُر زور ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے پوری رباعی میں ایک متحرک روح پیدا ہو جاتی ہے۔“^۶

مثلاً امجد حیدر آبادی کی یہ رباعیات دیکھیے۔

غم میں ترے زندگی بسر کرتا ہوں
زندہ ہوں مگر ترے لیے مرتا ہوں
تیری ہی طرف ہر اک قدم اٹھتا ہے
ہر سانس کے ساتھ تیرا دم بھرتا ہوں

☆☆☆

گرمی میں غم لبادہ نازیبا ہے
مستی میں خیال بادہ نازیبا ہے
کافی ہے ضرورت کے موافق دنیا
جامہ قد سے زیادہ نازیبا ہے

☆☆☆

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانندِ حباب ابھر کے اتراتا ہے

کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیں
تکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

☆☆☆

ہر چیز مُسَبَّبِ سبب سے مانگو
منت سے، خوشامد سے، ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

☆☆☆

ہر قطرے میں بحر معرفت مضمر ہے
ہر اک ذرے میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

فراق نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ روپ کے نام سے ان کی رباعیوں کا مجموعہ سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۳۴ رباعیاں ہیں۔ چوں کہ فراق فطرتاً جمال پرست اور رومان پسند تھے اسی لیے ہمیں ان کی غزلوں اور رباعیوں دونوں میں تخلیقی و فنی بصیرت، جمالیاتی احساس اور حسن و محبت کی دل فریب فضا کا بھرپور احساس ہوتا ہے تاہم ہندو ثقافت کے اثرات اور ہندی و سنسکرت کے نامانوس اور ثقیل الفاظ کے استعمال نے ان کے شعری حسن اور لطافت کو مجروح کیا ہے۔ ممالیات حسن و عشق کی فطری اور جذباتی مرقع نگاری اور محبوب کے حسن سراپا کا بیان انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ محبوب مع حسن کے ہماری آنکھوں کے سامنے متحرک اور رقص کناں نظر آتا ہے۔ ان کی چند رباعیاں دیکھیے:

ہر جلوے سے اک درسِ نمو لیتا ہوں
چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

☆☆☆

خاموش نگاہ کے تکلم کی قسم
اس سازِ جمال کے ترنم کی قسم
کلیاں سی چٹک رہی ہیں سینے میں تمام
مہکے ہوئے شبنمی تبسم کی قسم

☆☆☆

ہر شعلہ حسن جیسے بجتا ہو ستار
ہر خطِ بدن کی لو میں مدھم جھنکار
رنگین نگاہ سے کھل اُٹھتے ہیں چن
رس ہونٹوں کا پی کے جھوم اُٹھتی ہے بہار

☆☆☆

بھگی زلفوں کے جگمگاتے قطرے
آکاش سے نیلگوں شرارے پھوٹے
ہے سروِ رواں میں یہ چراغاں کا سماں
یا رات کی گھاٹیوں میں جگنو چمکے

اُسی زمانے میں جگت موہن لال رواں کا نام بھی ایک اہم رباعی گو شاعر کی حیثیت سے قابل ذکر ہے۔
روح رواں کے نام سے ان کی تقریباً پونے دو سو رباعیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ رواں کی رباعیوں میں تخلیقی و فنی
محاسن کے بہت سے رنگ اور پہلو نمایاں ہیں۔ بقول عزیز لکھنوی:

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ رواں کی رباعیاں باعتبار تنوع مضامین زبانِ اردو میں ایک خاص اضافہ ہیں۔^۷

چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

کیا تم کو بتائیں عمرِ فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
اک موجِ فنا تھی زندگانی کیا تھی

☆☆☆

غم شہر بہ شہر پھیلتا جاتا ہے
اللہ کا قہر پھیلتا جاتا ہے
اب تک تو دلوں میں حرارت تھی رواں
اب خون میں زہر پھیلتا جاتا ہے

☆☆☆

تابع ہمیں عقل کا کیے دیتی ہے
آزادی دل فنا کیے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے
فطرت سے ہمیں جدا کیے دیتی ہے

☆☆☆

غربت اچھی نہ جاہ و دولت اچھی
حاصل جس سے ہو دل کو راحت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہو
اُس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

تلوک چند محروم کا ذکر بھی رباعی گو شاعروں کے ضمن میں آتا ہے۔ رُباعیاتِ محروم کے نام سے ان کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ غالباً دوسو سے زیادہ رُباعیات انھوں نے کہی ہیں جن میں حمدیہ اور نعتیہ رُباعیات بھی ہیں اور اخلاقی موضوعات سے متعلق بھی، فکری و نظری نوعیت کی رُباعیات بھی ہیں اور پسند و نصائح سے معمور رُباعیات بھی۔ محروم کی شاعری جس فنی چنگی، تخلیقی جوہر، خیال کی بلندی، موضوعات و مضامین کے تنوع اور زبان و بیان کی خوبیوں سے عبارت ہے وہی کیفیت ہمیں ان کی رُباعیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ رُباعیاتِ محروم کی اشاعت دوم کے دیباچے میں برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی لکھتے ہیں کہ:

آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور آپ کا تخیل بلند و مستحکم اور بیان دل کش ہے۔ آپ کی ذہنیت توازن اور آپ کا شعور اعتدال سے مزین ہے۔ جن اوصاف اور اقدار کی رباعی کے لیے ضرورت ہے وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اور کلام کی طرح رُباعیاں بھی نہایت پسند کی جاتی ہیں۔^۸

مثلاً ان کی چند رُباعیات دیکھیے:

شغل بے جا نہیں سخن آرائی
قدرت کی اگر ہو یہ کرم فرمائی
آغاز اُسی کے نام پر ہے جس نے
بخشی ہے مُشتِ خاک کو گویائی

☆☆☆

پھولوں کے ورق ہیں دفتر بے معنی
اجرامِ فلک ہیں پیکرِ بے معنی
پڑ جاتی ہے نام سے ترے جاں اس میں
ورنہ یہ جہاں ہے منظرِ بے معنی

☆☆☆

فریاد ہے کس لیے درِ یزداں پر
الزام تراشتے ہو کیوں شیطان پر
یزداں نے کیے کبھی نہ شیطان نے کیے
انساں نے کیے ہیں جو ستم انساں پر

☆☆☆

مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام
حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی
مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

☆☆☆

دنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے
ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے
اس عالمِ آب و گل میں کیا رکھا ہے

یاس یگانہ چنگیزی کی رباعیاں بھی بڑی ہمہ گیر اور توانا ہیں۔ گنجینہ کے نام سے مطبع قومی دارالاشاعت لاہور سے ان کی رباعیوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ یگانہ کے مزاج میں جو ایک تلخی اور شدت تھی اس کے سنگ سنگ ان کا منفرد اسلوب اور مخصوص انداز شاعری ان کی غزلوں کی طرح رباعیوں میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یگانہ کی چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

موجوں سے لپٹ کے پار اُترنے والے
طوفانِ بلا سے کب ہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

☆☆☆

بخشش کسے کہتے ہیں عنایت کیسی
ملک اپنا ہے، مال اپنا، اجازت کیسی
قدرت کا خزانہ ہے تصرف کے لیے
تقدیر کے ٹکڑوں پر قناعت کیسی

☆☆☆

کیوں خانہء تاریک میں ہے گوشہ نشیں
ہے گلشنِ عالم بھی طلسمِ رنگیں
ہاں چونک ذرا سیر تو کر او غافل
آنکھیں جو ہوئیں بند تو پھر کچھ بھی نہیں

☆☆☆

سنتے نہیں پھر ہم جو بگڑ جاتے ہیں
دشمن ہو کہ دوست سب سے لڑ جاتے ہیں
ملنے کے نہیں اپنی جگہ سے کبھی یاس
بٹتے نہیں جب بات پہ اڑ جاتے ہیں

☆☆☆

دیکھے ہیں بہت چمن اُجڑتے بستے
کیا کیا گل بے خار لٹے ہیں سستے
اے زندہ دلائلِ باغ، اتنا نہ ہنسو
آنسو بھی نکل آتے ہیں ہستے ہستے

۱۹۴۳ء میں عالم آشوب کے نام سے سیما اکبر آبادی کا مجموعہ رباعیات منصف شہود پر آیا۔ اس میں بڑی تعداد میں رباعیات شامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

تمام رباعیاں دوسری عالم گیر جنگ سے تعلق رکھتی ہیں اور عام طور پر نازیوں کے ظلم و استبداد کی ترجمان ہیں۔ ہر چند کہ یہ رباعیاں حکومت کے اشارے پر کہی گئی تھیں اور ان کا مقصد برطانوی رعایا کے دل سے خوف و ہراس کو زائل کرنا تھا پھر بھی سیما کو تاریخ و صحافت کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ اکثر رباعیوں میں تاریخی واقعات عام سیاسی اور قومی مسائل بڑی خوب صورتی سے نظم ہوئے ہیں اور ان میں صحافتی رنگ کے باوجود ایک طرح کا شاعرانہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔^۹

چند رباعیات دیکھیے:

خمیازہ انقلاب کب نکلے گا
دل سے غم و اضطراب کب نکلے گا
دے گا جو پیام امن و بیداری کا
مشرق میں وہ آفتاب کب نکلے گا

☆☆☆

معمورِ غرض دین بھی ہے دنیا بھی
معمولِ ریا و مکر ہے دھوکا بھی
انسان ہی خطرے میں نہیں ہے اس وقت
خطرے میں ہے انسانیتِ کبریٰ بھی

☆☆☆

دبنے سے دبانے سے نہیں مٹ سکتی
یا خون بہانے سے نہیں مٹ سکتی

جس قوم میں احساس ہو قومیت کا
وہ قوم مٹانے سے نہیں مٹ سکتی

☆☆☆

جب چال یہ انقلاب چل جاتا ہے
آئینہ کو روندنا نکل جاتا ہے
پیرس کی تباہی سے یہ معلوم ہوا
فردوس بھی دوزخ سے بدل جاتا ہے

☆☆☆

تہذیب و سکوں کا ہو وہ منظر پیدا
انساں دلِ انساں میں کرے گھر پیدا
کردو انسانیت کو اس درجہ بلند
پھر ہو نہ سکے جہاں میں ہٹلر پیدا

☆☆☆

جاتا ہے حباب سیلِ دریا کی طرف
ڈرہ ہے رواں اونٹنِ ثریا کی طرف
اٹلی نے قدم بڑھائے ہیں جانبِ مصر
فرعون نے رُخ کیا ہے موسیٰ کی طرف

☆☆☆

جنگ ایک عجیب قسم کی بیماری ہے
دم بند ہے دنیا کا مگر جاری ہے
بدلے گا نیا روپ کوئی دہر کہن
تہذیبِ جدید کی یہ تیاری ہے

ان رباعیوں اور ان کے مجموعے میں شامل دیگر رباعیوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں حقیقت و واقعیت کا کتنا گہرا رنگ ہے۔ اہم موضوعات کو کس سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں ان کا سماج اور ہندوستان جن حوادث سے گزر رہا تھا ان کی عکاسی سیما ب نے بڑے اچھے اور دل کش شعری پیرائے میں کی ہے۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی مترجم رباعی گو کی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ میخانۂ خیام کے عنوان سے انھوں نے فارسی کے مشہور شاعر عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کیا۔ اسی طرح مولانا حامد حسن قادری اگرچہ ادبی تاریخ لکھنے، تنقید کرنے اور ادبی نوعیت کے دقیق مضامین لکھنے میں لاجواب تھے مگر شاعری اور وہ بھی رباعی لکھنے کے بجائے انھوں نے فارسی کے مشہور شاعر سید ابوالخیر کی فارسی رباعیوں کا اردو میں ترجمہ کیا نیز فارسی کے مشہور و قدیم شاعر باباطاہر عریاں ہمدانی کی بہت سی دو بیتوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا۔

اثر لکھنوی بھی رباعی کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ مغربی ادب سے شناسائی کے ساتھ ساتھ انھیں برصغیر کے سیاسی، معاشرتی اور قومی نوعیت کے مسائل اور علمی و ادبی رجحانات سے بھی گہری آشنائی تھی۔ ان کے یہاں شعری حسن و لطافت اور زبان کی نرمی وغیرہ تو پائی جاتی ہے تاہم موضوعات کی ندرت، مضامین کا تنوع اور افکار کی جدت اپنے ہم عصروں کی نسبت کچھ کم ہے۔ لالہ و گل کے نام سے فیروز سنز لاہور نے ان کی رباعیات کا مجموعہ شائع کیا۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

زاہد کی ریاضت تری قہاری ہے
عاصی کی جسارت تری غفاری ہے
پردا نہ کسی کا آج تک فاش ہوا
سر چشمہ رحمت تری ستاری ہے

☆☆☆

ہے بحث فضول گفتگو لا طائل
عرفانِ خودی ہے جستجو کا حاصل
اے احسن تقویم سمجھ راز اپنا
تجھ میں ہے خدا اور تو اتنا غافل

☆☆☆

کہتے ہیں کہ عشق مجھے کیا معلوم
اک درد ہے دل نشیں دوا نامعلوم
آغاز سے انجام کو نسبت ہے اگر
بجز تشنہ لبی شرح تمنا معلوم

اخگر اکبر آبادی نے بھی رباعیات لکھی ہیں۔ ان کی رباعیات میں مذہب و معرفت، اخلاقی موضوعات اور فطرت کے دل ربا اور دل کش مناظر کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں جامعہ پریس دہلی سے ان کا مجموعہ رباعیات شائع ہوا جسے محمد احمد ندوی نے مرتب کیا تھا۔

رباعیاتِ اخگر مراد آبادی کے مقدمے میں جناب محمد احمد ندوی کہتے ہیں کہ:

رباعیات بظاہر سادہ ہیں لیکن باطن کا معنی۔ ابنِ رشیق کی رائے ہے کہ بہترین شعر وہ ہے کہ بظاہر آسان معلوم ہو لیکن جب اس جیسا کہنا چاہیں تو دشوار ہو۔ اخگر صاحب کی رباعیات کا بھی کچھ یہی عالم ہے۔ آپ کا انداز بیان دل کش ہوتا ہے۔ حقیقت، سادگی اور جوش آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ اخگر صاحب مذہب و ملت، نسل و رنگ اور قوم و ملک کی تفریق سے بالاتر رہتے ہوئے آدمی زاد میں انسانیت کا جوہر نمایاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ بعض رباعیوں سے اس کا اندازہ ہو گا۔^{۱۰}

چندر رباعیات ملاحظہ ہوں:

اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھو
ہر بیچ کے آغوش میں پودا دیکھو
ذروں میں ہیں خورشید کے جلوے رقصاں
نظروں میں سمندر کا سراپا دیکھو

☆☆☆

ان تفرقوں کے میل کو دھو دے یارب
فرقوں کی خرافات کو کھو دے یارب
تسبیح کے بکھرے ہوئے ان دانوں کو
ڈورے میں محبت کے پرو دے یارب

☆☆☆

جس طرح سے ہیرے میں چمک ہوتی ہے
جس طرح سے پھولوں میں مہک ہوتی ہے
قالب میں اُسی طرح ہے روحِ انگر
انگاروں میں جس طرح دہک ہوتی ہے

☆☆☆

راحت کا ہر اک جان کی سماں بن جا
ہو درد جہاں تو وہیں درماں بن جا
اتنی تو مری مان ہی لے لے اے انگر
صورت میں ہے سیرت میں بھی انساں بن جا

☆☆☆

اللہ جہالت سے بچالے مجھ کو
غفلت کی حماقت سے بچالے مجھ کو
جو علم تری یاد سے غافل کر دے
اُس لعنتی آفت سے بچالے مجھ کو

☆☆☆

بچتے رہو امراضِ جفاکاری سے
پرہیز کرو ظلم کی بیماری سے
جس طرح جذامی سے بچا کرتے ہیں
اس طرح رہو دور دل آزاری سے

اثر صہبائی نے بھی بکثرت رُباعیات لکھی ہیں، ان کی رُباعیوں کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے۔ چند رُباعیات

ملاحظہ ہوں:

گزری ہے جگر کے زخمِ سیٹے سیٹے
زہر آبِ الم کے جامِ پیٹے پیٹے

سو بار اگرچہ کوہِ غم بھی ٹوٹے
گردن نہ کبھی جھکے گی جیتے جیتے

☆☆☆

سوزِ غم نایاب کہاں سے لاؤں
وہ جذبہ بے تاب کہاں سے لاؤں
تھی گرمی بازارِ محبت جن سے
وہ درد کے اسباب کہاں سے لاؤں

خان صاحب حکیم محمود علی خان صاحب ماہر اکبر آبادی نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ مجموعۂ رباعیات ماہر کے نام سے ان کی یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں، فراش خانہء دہلی سے شائع ہوئی جس میں تقریباً ۱۳۳ رباعیاں ہیں۔ ان رباعیوں میں حمدیہ و نعتیہ رباعیوں کے علاوہ پسند و نصح، وعظ و نصیحت، عبرت و موعظت اور حقائق و معارف کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ بقول سیما اکبر آبادی:

ماہر صاحب کی رباعیوں میں وہی برجستگی پائی جاتی ہے جو صنفِ رباعی کے لیے مخصوص ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی رباعیوں میں گنجلک اور پیچیدگی نہیں ہے۔ حکیم صاحب کے، میں اس ذوقِ انتخاب سے بے حد خوش ہوں کہ انھوں نے اپنی رباعیوں کے مجموعے میں کسی مبتذل اور رکیک رباعی کو جگہ نہیں دی اور رندی و سرمستی پر بھی جہاں اظہارِ خیال کیا ہے وہاں متانتِ فکر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔"

ماہر صاحب کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے!

دانا ہے تو یہ جنتیں بے کار نہ کر
عاقل ہے تو بے فائدہ تکرار نہ کر
اللہ کی قدرت ہے عیاں ہر شے سے
آنکھیں ہیں تو اللہ کا انکار نہ کر

☆☆☆

اسلام کا مرتبہ بڑھایا تم نے
کفار کا طنطنہ گھٹایا تم نے
کیا کم ہے جہاں پر یہ تمہارا احساں
اللہ سے بندوں کو ملایا تم نے (رسول اکرم)

☆☆☆

ہو تزکیہ نفس کا، کہ طاعت ہے یہی
ہو پاک اگر نفس تو جنت ہے یہی
رکھ پاک تعصب سے تو اپنے دل کو
سب سے افضل یہاں عبادت ہے یہی

☆☆☆

اک رسم گناہ ہر طرف جاری ہے
پھیلی ہوئی خوف ناک عیاری ہے
سیکھا دنیا سے ہم نے یہ اے ماہر
دنیا مطلق فریب و مکاری ہے

☆☆☆

احبابِ دغا باز کی اُلفت سے بچو
اشرار کی، انفار کی قربت سے بچو
ہے بہتری مقصود تو یارانِ عزیز
اچھوں سے ملو اور بُری صحبت سے بچو

☆☆☆

اے زاہدِ مکار کبھی غور تو کر
کیا تجھ کو نہیں ہے اس حقیقت کی خبر
جس زہد کی ہو محض ریا پر بنیاد
اس زہد سے سو مرتبہ رندی بہتر

صد پارہٴ دل کے نام سے خواجہ دل محمد کی رباعیوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے بلکہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ریاضیات کے صدر رہ چکے تھے۔ چوں کہ وہ ریاضی دان تھے اس کے باوجود انھوں نے اپنی تخلیقی و فنی مہارت سے ریاضی اور دوسرے علوم کے خشک اور اہم موضوعات کو اپنی رباعیات میں بڑے سلیقے اور خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ مثلاً ان کی ایک رباعی دیکھیے:

ہر خار سے گلستان اُلتے دیکھا
ہر قطرے میں آسماں اُچھلتے دیکھا
ہر ذرے میں ہے نظامِ شمسی بے تاب
ہر کاہ کو کہکشاں اُگلتے دیکھا

خواجہ دل محمد کی رباعیات کا ایک اور مجموعہ رباعیاتِ دل کے نام سے ۱۹۴۱ء میں خواجہ بک ڈپو، موہن لال روڈ لاہور سے شائع ہوا جس میں ۱۴۶ رباعیات شامل ہیں۔ موضوعات کے تنوع، مضامین و خیالات کی ندرت، شاعرانہ صلاحیت اور فن کارانہ مہارت کے لحاظ سے یہ رباعیات لاجواب ہیں۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

پانی میں اگر نہ ہو روانی بے کار
غفلت میں کئے جو نوجوانی بے کار
قانونِ جہاں سے ارتقا و حرکت
بے ذوقِ عمل ہے زندگانی بے کار

☆☆☆

ذرے کی گرہ میں اک جہاں ہے موجود
قطرے میں فرازِ آسماں ہے موجود
کھول آنکھ طلسمِ ہیچِ مقداری توڑ
سینے میں ترے کون و مکاں ہے موجود

☆☆☆

کچھ لوگ بنے ہیں خردہ چینی کے لیے
اوروں میں عیوبِ آفرینی کے لیے
دانا ہیں وہی جو کر کے سب سے اغماض
تیار ہیں اپنی عیبِ بنی کے لیے

☆☆☆

دکھائے چمک سحر کا تارا کب تک
دم بھر کی حیات کا سہارا کب تک
خورشید کے خوف سے ہے لرزش پیہم
انگارے پہ رُک سکے گا پارا کب تک

☆☆☆

سُورج میں جو وضع خود نمائی دیکھی
مہ میں وہی طرزِ دل رُبائی دیکھی
صنعت میں جھلک رہا ہے صانع کا اثر
ہر ذرّے میں شانِ کبریائی دیکھی

☆☆☆

محصور ہوں میں یہاں نہ معذور ہوں میں
قدرت کے کسی مشن پہ مامور ہوں میں
پُرزوں ہی سے چل رہی ہے دنیا کی مشین
پُرزہ یہ سمجھ رہا ہے مجبور ہوں میں

تضمین الامثال رئیس الشعرا حضرت اصغر شاہ جہاں پوری کے مجموعے کا نام ہے جو نظامی پریس لکھنؤ سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا جس میں تقریباً ۱۰۳ رباعیاں ہیں جن کی خاص خوبی یہ ہے کہ چوتھے مصرعے میں ضرب المثل بیان کی گئی ہے جو رباعی میں بیان کردہ مضمون سے مماثلت رکھتی ہے۔ اسی لیے اس رباعی کے مجموعے کا نام تضمین الامثال رکھا گیا ہے۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

یہ ناصح عقل کا تیری خلل ہے
قدم بوسیِ عداوت کا بدل ہے
کہیں کیا یہ بھی اک حسنِ عمل ہے
حسابِ دوستاں درِ دلِ مثل ہے

☆☆☆

خندِ ناز بھی تھا کس بلا کا
کیا مجروح دل اک بے خطا کا
چلا سُوئے عدم کہتا یہ بس
مثل سچ ہے کہ سیدھا گھر خدا کا

☆☆☆

ذکرِ فن سے باز آؤ ذکرِ فن جانے بھی دو
وقت کہتا ہے کہ نااہلوں سے مل جل کر رہو
اس مثل پر شاعروں کا آج کل چلتا ہے کام
من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

☆☆☆

یہ حال ہے کہیں جاتے ہیں اب نہ آتے ہیں
کسی خیال میں اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ جاتے ہیں
ہر ایک دیکھنے والے کو اب یقین یہ ہے
کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں

☆☆☆

زر کے ہمراہ زور بل دے گا
مجھ کو آرام مجھ کو کل دے گا
فکر کی مجھ کو کیا ضرورت ہے
آج جس نے دیا ہے کل دے گا

☆☆☆

کب اچھے کام کا کوئی بُرا انجام ہوتا ہے
جو ہیں اہل کرم دنیا میں ان کا نام ہوتا ہے
بہت مشہور ہے یہ تو مثل تم نے سنی ہوگی
کھری مزدوری ملتی ہے تو چوکھا کام ہوتا ہے

شیام موہن لعل جگر بریلوی کا شمار اپنے وقت کے اچھے اور بڑے شعرا میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے غزل، نظم، مثنوی اور رباعی، ان تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ بقول ڈاکٹر لطیف حسین ادیب:

جگر بریلوی کی رباعیاں اس اعتبار سے متنوع نہیں ہیں کہ ان میں کچھ سیاسی، کچھ متصوفانہ و اخلاقی اور کچھ رندانہ مضامین باندھے گئے ہیں بلکہ وہ متنوع اس اعتبار سے ہیں کہ ان رباعیوں میں جگر صاحب کی طرح ان کے شاعرانہ تجربے اور ان کے محسوسات کی مختلف فضا میں ملتی ہیں۔ جگر صاحب کی رباعیات کا رنگ کلاسیکل ہے۔"

جگر بریلوی صاحب کا مجموعہ رباعیات "رس" کے عنوان سے ۱۹۶۰ء میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے شائع کیا جس میں ۳۲۱ رباعیاں ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہوں!

جب رنج سے جی نڈھال ہو جاتا ہے
جب حد سے سوا ملال ہو جاتا ہے
محویتِ غم سے دل کی گہرائی میں
محسوس ترا وصال ہو جاتا ہے

☆☆☆

تدبیر و عمل کا زندگانی ہے نام
تکمیل صفات ہی بشر کا ہے کام
پوری ہو دماغ و دل کی گر نشو و نما
ہے زندگی خود ہی زندگی کا انعام

☆☆☆

کر جاتی ہے کچھ کام اگر عقل رسا
ہے زندگی خود ہی زندگی کا انعام
ہستی کی قیود بھول جاتا ہے بشر
ہوتا ہے جو تدبیر سے عقدہ کوئی وا

☆☆☆

ہر روز نیا فتنہ نیا شر دیکھا
اپنے کو سمجھتا ہے کہ ہوں میں ہی خدا
اس پر کہتے ہیں یہ ترقی کا ہے دور
ہنگامہء جنگ بھی مکرر دیکھا

☆☆☆

جینا ہے اگر تو کام کرنا سیکھو
خاکے میں بقا کے رنگ بھرنا سیکھو
تم ہی ہو ضمیرِ دین و دنیا کے جگر
اپنے جوہر سے خود سنورنا سیکھو

☆☆☆

پہلے رنگینوں میں الجھاتی ہے
انسان کو سبز باغ دکھلاتی ہے
پھر زخم پہ زخم ہے لگاتی دنیا
سر تا سر زیست درد بن جاتی ہے

رباعیاتِ صادقین کے نام سے ۱۹۷۰ء میں مشہور مصور و خطاط صادقین کی رباعیوں کا مجموعہ شائع ہوا جسے خود صادقین نے ترتیب دیا۔ اس مجموعے میں تقریباً ساڑھے نو سو یا ایک ہزار کے قریب رباعیات ہیں۔ اتنی کثیر تعداد کی رباعیات میں بڑی تعداد ایسی رباعیات کی ہے جن میں عشق و محبت کے جذبات کا بیان ہے یا حسین و خوب روؤں کا ذکر ہے۔ ایسی رباعیات بھی خاصی تعداد میں ہیں جن میں فکر و خیال کا عنصر ملتا ہے۔ بطور مثال چند رباعیات ملاحظہ ہوں:

قرطاس پہ ہاں جلوے دکھاتا ہے یہ کون
پردے میں مرے نقش بناتا ہے یہ کون
یہ سچ ہے کہ موم قلم گھماتا میں ہوں
لوحوں پہ مرا ہاتھ گھماتا ہے یہ کون

☆☆☆

کس نے کیا دل کا خوں نہیں ہے معلوم
کیا راز ہے اندروں نہیں ہے معلوم
ہاں ہاتھ میں مُو قلم ہے میرے
میں ہاتھ میں کس کے ہوں نہیں ہے معلوم

☆☆☆

جب دل میں ہر اک درد کو پالا میں نے
شہکار کو سینے سے نکالا میں نے
اک کرب وجود ہے کہ جس کو پیہم
ان نقش و نگار میں ہے ڈھالا میں نے

☆☆☆

کہتا ہے مصور کہ ہیں گھاتیں کیا کیا
نقاشی میں کاٹ دی ہیں راتیں کیا کیا
ہر رات خیالات سے میرے کی ہیں
قرطاس کی سادگی نے باتیں کیا کیا

☆☆☆

کب حرص پرستی ہے ہمارا مسلک
آرائش ہستی ہے ہمارا مسلک
سرمایہ پرستی ہے شعارِ دنیا
اور حسن پرستی ہے ہمارا مسلک

☆☆☆

رباعی کے حوالے سے ایک اور اہم نام جناب راغب مراد آبادی کا ہے جنہوں نے خود اپنی کتاب رگِ گفتار

(مطبوعہ: ۱۹۸۹ء) کے شروع میں "حرفِ گفتنی" میں لکھا ہے کہ!

۱۹۳۰ء سے اب تک دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ کئی ہزار غزلیں اور رباعیاں کہی ہیں۔ اس مجموعے میں صرف
۱۳۷ غزلیں اور ۱۶۱ رباعیاں بطور نمونہ نذرِ قارئین ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں میرے جوان بیٹے نفیس راغت نے

و آئی اجل کو لبیک کہا۔ وطن سے دور بہت دور الجزائر کی بندرگاہ عتابہ میں اس کی رحلت میرے لیے قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھی۔ میں نے اس صدمہء جان کاہ کے زیر اثر چہلم تک ۳۰۰ رباعیاں کہی تھیں۔ مجھے یاد ہے میں نے پہلی رباعی غالباً ۱۹۳۶ء میں کہی تھی۔ ان رباعیات کے علاوہ جو اس مجموعے رگِ گفتار میں ہیں کم و بیش ۴، ۵ ہزار رباعیاں ہوں گی۔^{۱۳}

اب آپ خود ملاحظہ فرمائیں ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۰ء سے جو شخص رباعی کہہ رہا ہو اور ہزاروں کی تعداد میں رباعیات کہہ چکا ہو اس کی قادر الکلامی، فنی مہارت، تخلیقی صلاحیت اور رباعی گوئی میں اس کے کمال میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ راغب صاحب ہمارے عہد کے ایک بڑے اور نامور شاعر تھے۔ انھوں نے دیگر اصناف کی طرح اپنی رباعیوں میں اپنے داخلی جذبات، خارجی حالات و واقعات، جمالیاتی احساسات، اخلاقی موضوعات، انسانی فطرت کی کمزوریوں، اس کے ذہنی و فکری غلط رجحانات، انسان کے ارد گرد کے ماحول اور دنیا کے تلخ اور افسوس ناک واقعات کو بڑے موثر اور دل کش انداز میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ واعظانہ اور ناصحانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ لفظوں پر ان کی گرفت اور ان کا بر محل خوب صورت استعمال ان کی رباعیوں میں بخوبی دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی کچھ رباعیات ملاحظہ فرمائیے:

محسن کو سمجھتا ہے یہ گردِ نعلین
کم ظرف کے دل کو پھر بھی آتا نہیں چین
احسان فراموش نہیں ہو سکتا
انسان، اگر ہے وہ نجیب الطرفین

☆☆☆

پروان چڑھے خاکِ شرافت اپنی
خوابیدہ ہے مدت سے حمیت اپنی
آزاد تو ہم ہو گئے راغب لیکن
قبضے میں ہے غیروں کے معیشت اپنی

☆☆☆

صہبائے انانیت کی مستی نہ گئی
حرص و ہوس و دراز دستی نہ گئی

اُڑنے کو اڑا بہت بلندی پہ مگر
انساں کے خیالات کی پستی نہ گئی

☆☆☆

جب بھی رُخِ ماضی پہ نظر جاتی ہے
اک برقِ افقِ ذہن پہ لہراتی ہے
گزرے ہوئے لمحوں کے جوبِ چومتا ہوں
انفاسِ جوانی کی مہک آتی ہے

☆☆☆

کھلتے ہوئے پھولوں کی مہک ہے عورت
ہنستے ہوئے تاروں کی چمک ہے عورت
انگڑائی اگر لے تو سرِ چرخِ جمال
رنگین و دل آویز دھنک ہے عورت

☆☆☆

دنیا میں ہیں آثارِ تباہی اب تک
خنداں ہے غرورِ کج کلاہی اب تک
سورج تو ضیا بار ہے آزادی کا
لیکن ہے کہیں کہیں سیاہی اب تک

☆☆☆

مذہب کا وجود باعثِ رحمت ہے
مذہب سے گریز موجبِ حیرت ہے
انسان سے انسان کی نفرت راغب
مذہب کی نہیں فکر کی عصبیت ہے

☆☆☆

اے چاند کی سرزمیں پہ جانے والو
مریخ کو زیرِ دام لانے والو
دنیا کو بناؤ گے جہنم کب تک
ایٹم کی ادا پہ مسکرانے والو

☆☆☆

بیدار ابھی فتنہ چنگیزی ہے
سرگرم عمل روح شراستگی ہے
انسان کو دنیا میں سکوں خاک ملے
انسان خود آمادہ خوں ریزی ہے

اُردو رباعی کے حوالے سے ایک اہم نام منظور حسین شوریگ کا بھی ہے جن کا مجموعہ رُباعیات دہن و ضمیر ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۹۹۱ء میں یہ مجموعہ رُباعیات شائع ہوا۔ شوریگ صاحب کی رباعیاں موضوعات و مضامین کے لحاظ سے بہت اہم اور خاص مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اس صنف کے اصولوں کا خاص خیال رکھا بلکہ ذہنی و فکری لحاظ سے اعلیٰ و ارفع موضوعات کو عمدگی سے رباعی میں بیان کر دیا ہے۔ مثلاً ان کی یہ رباعیات ملاحظہ ہوں:

ہر چند یہ نظارہ نگاہوں پہ ہے شاق
لیکن یہ نظارہ ہے محیطِ آفاق
بہرے بھی عطا کرتے ہیں نغمے کی سند
اندھے بھی اڑاتے ہیں اُجالے کا مذاق

☆☆☆

ہے وقت کا سیلاب وہ قدرت کا عتاب
ہر عہد کے سقراط ہیں جس میں تر آب
تینکے تو نظر آتے ہیں موجوں پہ سوار
ہو جاتی ہیں سنگین چٹانیں غرقاب

☆☆☆

دریا سے کنارے کا طلب گار ہے تو
بازار میں فاقوں کا خریدار ہے تو
آغوشِ اجل ہے، نہ فنا جس کا نصیب
تاریخ کے بستر کا وہ بیمار ہے تو

☆☆☆

اس تخم کو آذہان میں بونا بھی جرم
اس خواب میں اقوام کا سونا بھی ہے جرم
فرقِ حق و باطل کو مٹانے کے لیے
تاریخ کے اوراق کو دھونا بھی ہے جرم

اظہر قادری صاحب ادیب، نقاد اور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری قدیم و جدید دونوں رنگوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ جذباتیت اور رومانیت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری سیاسی و معاشرتی مسائل کی بھی ترجمان ہے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ اظہر قادری نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ علامہ رضا علی وحشت کلکتوی، جو خود اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں، ان کے بقول:

اظہر قادری نے متعدد ادبی مضامین پاکستان کے موقر رسالوں میں لکھے ہیں جو وقعت کی نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ اکثر میں نقد و نظر کا پہلو واضح نظر آتا ہے۔ اصنافِ سخن میں اظہر قادری نے فنِ رباعی کو اپنایا ہے اور اس صنف میں ایک نمایاں مرتبہ حاصل کیا ہے۔ ان کی رباعیوں میں ایک والہانہ کیف پایا جاتا ہے جس کا اثر پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں پر گہرا ہوتا ہے۔^{۱۴}

ان کی رباعیاں فنی پختہ کاری اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اچھوتے خیالات کی مظہر ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

تکلیف بُلانے کی جو کی ہے تم نے
اور دعوتِ نظارہ بھی دی ہے تم نے
سب ٹوٹ گئے تارِ گریبانِ حیات
انگڑائی پس پردہ جو لی ہے تم نے

☆☆☆

منزل پہ پہنچنا ہے تو چلنا سیکھو
گرنا تو ہے آسان سنبھلنا سیکھو
حالات سے یہ تم پہ اُداسی کیوں ہے
ظلمت کو اُجالے سے بدلنا سیکھو

☆☆☆

مے خانے پہ پرکیف گھٹا چھائی ہے
پینے کی پلانے کی گھڑی آئی ہے
بچھم سے جو اُٹھی ہے یہ گھنگھور گھٹا
شاید کسی بدمست کی انگڑائی ہے

☆☆☆

ظالم کو ہمیشہ یہ بھلا دیتی ہے
مظلوم کو اک شان بقا دیتی ہے
ہنستے ہوئے جو دار پہ چڑھ جاتے ہیں
تاریخ امر ان کو بنا دیتی ہے

☆☆☆

دل سے باندھا تھا سلسلہ دل کا
ایسا جھٹکا لگا کہ ٹوٹ گیا
ہائے افسوس آپ کا دامن
میرے ہاتھوں میں آکے چھوٹ گیا

درد کی قندیل فراست رضوی رباعیات کا مجموعہ ہے جیسے ۲۰۱۴ء میں اکادمی بازیافت، نے شائع کیا ہے جس میں تقریباً چار سو تیرہ (۴۱۳) رباعیاں ہیں۔ دو سو چالیس (۲۴۰) صفحات پر مشتمل اس مجموعہ رباعیات پر مشہور خطیب اور عالم دین علامہ طالب جوہری کی پر مغز تقریظ ہے جو بقول فراست رضوی: انھوں نے (علامہ طالب جوہری) اپنی تحریر سے یہ ثابت کر دیا کہ فارسی اور اردو رباعی کی ادبی تاریخ اور اس کے انتقاد پر بھی ان کی گرفت بے نظیر ہے۔

فراست رضوی اعلیٰ ادبی ذوق اور ایک نکھرے ہوئے شعری مزاج کے حامل ہیں اور اس مجموعہ رباعیات سے قبل ان کے کچھ اور شعری مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ادبی و شعری حلقوں کے ساتھ ساتھ قارئین شعر و ادب سے دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کی رباعیات کے مطالعے سے ان کی تخلیقی قوت، فنی اور فنِ رباعی پر مہارت اور زبان و بیان پر ان کی گرفت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شعری جمالیات کے پہلو بہ پہلو اپنے عہد اور معاشرے کے مسائل، طاقت ور لوگوں کا کمزوروں اور بڑی قوموں کا چھوٹی قوموں پر ظلم و استبداد، بین الاقوامی سیاست کے انسانی نقطہ نظر سے منفی اور ہول ناک رجحانات، مشرق، مغرب کی باہمی آویزش، دہشت گردی اور قتل و غارت گری کا بڑھتا ہوا سلسلہ، انسان کی معاشرتی الجھنیں، انسانی معاشرے پر پھیلے ہوئے خوف، تذبذب، عدم تحفظ اور عدم اطمینان کے پھیلتے ہوئے سائے، ان تمام موضوعات کو فراست رضوی نے بڑی خوبی اور عمدگی سے اپنی رباعیوں میں بیان کیا ہے۔ عقلی و فکری و جمالیاتی موضوعات کے ساتھ ساتھ عصری آگہی اور سماجی شعور ان کی رباعیات میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مثلاً یہ رباعیات دیکھیے:

کل عشق کی راہوں سے جو دیکھا اُس نے
پلکوں کی پناہوں سے جو دیکھا اُس نے
اک چاند سا جیسے مرے دل میں چمکا
دُزدیدہ نگاہوں سے جو دیکھا اُس نے

☆☆☆

یادوں کو سرِ شام لیے بیٹھا ہوں
لوحِ غمِ ایام لیے بیٹھا ہوں
کل کیسا چھلکتا تھا یہ پیانہء عمر
اب دُردِ تہِ جام لیے بیٹھا ہوں

☆☆☆

غارت گری و جنگ کی عادت نہ گئی
افراد کی افراد سے نفرت نہ گئی
کیا کیا نہ کیے علم و ہنر میں اعجاز
لیکن دلِ انساں کی شقاوت نہ گئی

☆☆☆

آنکھوں میں نہیں کچھ بھی تیر کے سوا
جاتے ہوئے لمحوں کے تصور کے سوا
بدلے گا نہ دستور بدل جانے کا
ہر شے میں تغیر ہے تغیر کے سوا

☆☆☆

موجودی مبہم کی نشانی کی تلاش
دنیا میں جوازِ عمر فانی کی تلاش
لا یعنی شب و روز میں کرتے ہی رہے
ہم اپنے وجود کے معانی کی تلاش

☆☆☆

دنیا سے نہ دل لگاؤں، کاہل رہ جاؤں
طوفاں نہ بنوں صورتِ ساحل رہ جاؤں
وہ علم جو انکارِ خدا کرتا ہے
اُس علم سے بہتر ہے کہ جاہل رہ جاؤں

رباعی کی صنف نے موضوعاتی تجربات میں مضامین حسن و عشق سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور عارفانہ و متصوفانہ مضامین کی گزر گاہ سے عقیدت کے پیرائے کو اختیار کیا۔ انیس و دہیر کے عہد میں خالصتاً مذہبی رنگ اختیار کرنے کے بعد پہلی جنگ عظیم میں یک بارگی رباعی پر عصری آگہی کا رنگ غالب آگیا۔ اس وقت سے تاحال یہ جمالیات سے سماج و معاشرت سے جڑے ہر مضمون کو اس خوبی سے خود میں سمونے کا حوصلہ رکھتی ہے کہ اختصار و جامعیت کے لیے شعرا کی نگہ انتخاب اسی صنف سخن پر پڑتی ہے۔

حوالہ جات:

- ۱۔ اصنافِ ادب، رفیع الدین ہاشمی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۸۲-۸۳
- ۲۔ اُردو رباعی، (فنی و تاریخی ارتقا)، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مکتبہ عالیہ، لاہور، اشاعت چہارم: ۲۰۰۱ء، ص ۶۶
- ۳۔ کلیاتِ سراج، مرتبہ: عبدالقادر سروری، ۱۹۳۰ء، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ص ۵۳۸-۵۳۹
- ۴۔ اُردو رباعی، ص ۹۵

- ۵۔ رباعیات شاد عظیم آبادی، ترتیب و مقدمہ: حمید عظیم آبادی، کرشنا پریس، پٹنہ، ۱۹۴۵ء، ص ۲۸-۲۹
- ۶۔ جدید اُردو شاعری، عبدالقادر سروری، کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ۲۴۰-۲۴۱
- ۷۔ روح رواں، جگت موہن لال رواں، ۱۹۲۸ء (مقدمہ) عزیز لکھنوی، مطبوعہ: ۱۹۲۷ء، ص ۴۳-۴۴
- ۸۔ رباعیات، سحروم، تلوک چند محروم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۵۳ء، دیباچہ: برج موہن و تاتریہ کیفی دہلوی، ص ۱۸-۱۹
- ۹۔ اُردو رباعی، ص ۱۲۵
- ۱۰۔ رباعیات اخگر، مرتبہ: محمد احمد ندوی، مطبوعہ: جامعہ پریس، دہلی، ۱۹۳۴ء (مقدمہ: محمد احمد ندوی)، ص ۱۲-۱۳
- ۱۱۔ رباعیات، سایہ، ماہر اکبر آبادی، دیباچہ: سیما اکبر آبادی، فراش خانہ دہلی، مطبوعہ: ۱۹۳۷ء، ص ۱۱-۱۲-۱۳
- ۱۲۔ رس، جگر بریلوی، مقدمہ: ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، نیم بک ڈپو، لکھنؤ، مطبوعہ: ۱۹۶۰ء، ص ۱۲
- ۱۳۔ لب گفتمان، راغب مراد آبادی، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، مطبوعہ: ۱۹۸۹ء، ص ۱۲
- ۱۴۔ اظہر قادری کی رباعیات، علامہ رضا علی وحشت (مشمولہ سہ ماہی "پیش رفت" انٹر نیشنل)، کراچی، اگست تا نومبر ۲۰۰۲ء تا جنوری ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۲

Abstract

This article presents renowned Urdu poets of the form of quadrant spanning from the Dakni period to date for which a good number of quadrants quoted to analyze how the very form of poetry presents a wide range of topics such as classical, romanticism, social, political, melancholic, sorrowful and ethical moods etc. Quli Qutub Shah has been reckoned to be the first Urdu poet to use this form to present love themes. On the other hand, Siraj Orangabadi used the form to express his melancholic and sorrowful moods. Mir Taqi Mir also used the form to present his many inner feelings. The poets hailing from Dehlavi school of thought including Mirza Ghalib, Zuaq, Zafar, Momin, Sheefta depicted their sentiments using it but Momin was one of the rare examples among his contemporaries who used the form of quadrant frequently. Known Marcia poets Anees and Dabeer presented ethical themes. Altaf Husain Hali, Ismail Merathi, Akbar Ilahabadi and Shad Azeemabadi presented religiously motivated themes. The article quoted many contemporary poets who used quadrants as a vehicle for presenting their feelings.

Keywords: Urdu quadrants, Dakni period, Urdu contemporary poets of quadrants.